سید مطلوب حسین
مترجمہ سید سجاد رضوی

عہدِ خلفائے راشدین کے معاشرتی حالات[1]

(۳)

اسلام نے اُس دَور کے بگڑتے ہوئے ازدواجی تعلقات کا جو بہتر حل پیش کیا اُسے بعد ازاں غلط طریقے پر استعمال کیا گیا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں لوگوں نے اس رعایت کو نہ صرف واجب گردانا بلکہ اُسے اسلام کے دوسرے بُنیادی اُصولوں سے بڑھا چڑھا کر نمایاں حیثیّت دی۔ اس دَور میں ایسے لوگوں کو تلاش کرنا مشکل ہے جنھوں نے یہ رویّہ اختیار نہ کیا ہو۔ اس زمانے میں عام طریقہ یہ تھا کہ ہر مسلمان کنیزوں کے علاوہ ہر وقت چار عورتیں اپنے نکاح میں رکھتا تھا۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے یہ فتوحات کا دَور تھا۔ ہر سمت سے دولت چلی آرہی تھی، اس لیے وقتی طور پر کسی قسم کی معاشرتی پریشانی کا سامنا نہیں تھا اور وہ عمرانی بُرائیاں جو بڑی تیزی سے پھیل رہی تھیں، اُن پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جاتا تھا لیکن خلافتِ راشدہ کے آخری سال بڑے المناک سانحات سے بھرپور رہیں۔ اور ایک ذہین مورّخ یہ بات بڑی آسانی سے دیکھ سکتا ہے کہ سیاسی استیلا کی جنگ کو صرف ذاتی خواہشات ہی نے ہوا نہیں دی۔ بلکہ عمرانی انتشار بھی اس کا ذمہ دار تھا۔ مسلم اشرافیت نے ایران کے قدیم سرداروں کے نصب العین کو اپنانا شروع کر دیا۔ اور اس خواہش نے اُن سیاسی سازشوں اور مصلحت بینی کی تمام بُرائیوں کو جنم دیا جو خالصتاً مادّی ثقافت کی علامات ہیں۔ یہ بات بڑی واضح طور پر نظر آسکتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام کے وقت تک مسلمانوں کا والہانہ جوش، اُن کا خلوص، اور مبلّغانہ مساعی کافی حد تک دھیمی پڑ چکی تھیں اور اس کا کُھلا سبب یہ ہے کہ اُن کی توجّہ روح کی بالیدگی کی طرف کم تھی اور جسم کی آسائشیں انہیں زیادہ بھاتی تھیں۔

غلام اور کنیزیں

غلاموں اور کنیزوں سے پیدا ہونے والے مسائل آپس میں بڑا گہرا تعلّق رکھتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا۔ جس سے یہ رواج بالکل ممنوع قرار دیا جائے۔ اور اس نظریئے کی حمایت میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی روش کو بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ مگر ان باتوں میں سے کوئی چیز بھی صحیح نہیں۔ اسلام نے

---

[1] یہ مقالہ سید مطلوب حسین صاحب کا ہے لیکن گذشتہ قسطوں میں سید عابد علی عابد کا نام درج ہوگیا۔ ہم اس غلطی کے لیے محترم مقالہ نگار سے معذرت خواہ ہیں۔

بالکل غیر مبہم طریق پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہر انسان آزاد ہے۔ اور اسے کسی دوسرے انسان کی غلامی قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ انسان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ تمام نوع انسان کو ایک برادری کی حیثیت دی گئی تھی جس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ تھی۔ قرآن مجید میں بہت سی آیات ملتی ہیں، جن سے ان باتوں کا اثبات ہوتا ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً	تمام انسان ایک ہی اُمت ہیں۔
وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ	سارے انسان ہی ایک ہی امت لیکن وہ اختلاف کر بیٹھے۔
وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ	اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔
إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ۔	فیصلہ اس اللہ ہی کا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

اب جہاں تک غلاموں کی تجارت کے مسئلے کا تعلق ہے۔ اس کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسی قسم کی معذرت کئے بغیر قرآن مجید سے نصِ صریح تلاش کی جائے۔ قرآن اسلامی مملکت میں کسی شہری کو کسی بھی وجہ سے غلام بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ وہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ممالکِ غیر میں افواج کسی شہری کو گرفتار کریں، اُس کی توہین کریں یا اُسے غلام بنائیں۔ صرف جنگ ہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے کوئی شخص اسلامی مملکت میں غلام کی حیثیت سے داخل ہو سکتا ہے۔ صرف جنگی قیدی ہی غلام بنائے جا سکتے ہیں، ان قیدیوں کے متعلق قرآن کا یہ حکم ہے کہ اسلامی مملکت میں ان کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ محبوس کیا جا سکتا ہے۔ یا فدیہ لے کر یا فدیہ کے بغیر انہیں رہا کیا جا سکتا ہے۔ یہی مختلف صورتیں ہیں۔ جن میں سے موجودہ حالات کے مطابق مملکت کوئی ایک اپنا سکتی ہے۔

خلافتِ راشدہ کے زمانے میں عام طریقہ یہ تھا کہ ان میں سے تمام صورتیں اختیار کی گئی تھیں لیکن زیادہ تر یہی ہوتا تھا کہ قیدیوں کو غلاموں کی حیثیت میں مجاہدین کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس زمانے میں کوئی ایسا انتظام نہ تھا کہ اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کو جیل خانوں میں رکھا جاتا۔ دوسری وجہ مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ اگر یہ قیدی مسلمانوں کے حوالے کر دیئے جائیں تو ممکن ہے وہ کچھ دیر کے بعد حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں۔ اور اچھے شہری بن سکیں دوسری بات زیادہ پیشِ نظر رہی، اور تاریخ اسلام سے ایسی روشن مثالیں بکثرت دستیاب ہو سکتی ہیں کہ آزاد شدہ غلاموں نے تاریخ اسلام کو بنانے اور سنوارنے میں بڑی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن اس کے باوصف قرآن مجید میں کوئی ایسا حکم نہیں جس کی بنا پر حکومت مجبور ہو کہ وہ قیدیوں کو مختلف افراد میں بانٹ دے۔ اگر اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی صورتِ احوال بدل جائے تو اس طرزِ عمل کو بغیر کسی قانون کی خلاف ورزی کئے ہوئے

ترک کیا جا سکتا ہے، لہٰذا اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اگر مسلمان اس اسلامی قانون کی سختی سے پابندی کرتے تو مسلمان معاشرے سے غلام ناپید ہوتے۔ بہرحال اس قانون کی کسی حد تک پابندی کی گئی۔ غلاموں کو اکثر اوقات جلدی آزاد کر دیا جاتا لیکن کنیزوں کو فاتحین کے جذبات کی تسکین کے لیے رکھ لیا جاتا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ہر مسلمان گھرانا تا حدِ مقدور کنیزوں سے بھر چکا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ عیش و عشرت کی فراوانی، جرائم اور عمرانی انتشار کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس بُرائی کا ایک ہی علاج تھا کہ قیدیوں کو تقسیم کرنے کا یہ طریقہ ختم کر دیا جاتا مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔

دوسری طرف یہ ہوا کہ مسلمانوں نے غیر اسلامی ممالک سے غلام اور کنیزیں درآمد کرنا شروع کر دیں جس کے لیے قرآن کوئی وجۂ جواز نہیں دیتا اور جو قطعی طور پر روحِ اسلامی کے خلاف ہے۔ کیونکہ اُس نے تو یہ حکم دیا تھا کہ صرف جنگی قیدی ہی غلام بن سکتے ہیں۔ اور یہ اجازت نہیں دی تھی کہ غلاموں کو سامانِ تجارت بنا دیا جائے اور اور انہیں بیرونی ممالک سے درآمد کیا جائے۔

لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ تو یہ ہے کہ کنیزوں سے مباشرت کی قانونی اجازت تھی جبکہ اُنہیں نہ تو باقاعدہ منکوحہ عورتوں کی حیثیت دی جاتی اور نہ اُن سے باقاعدہ نکاح ہوتا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں یہ طریقہ عام تھا اور اگر ہم مسعودی کی روایت پر اعتبار کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ خود پیغمبر اسلام کے بڑے بڑے جیّد صحابیوں کے ہاں کنیزوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہوا کرتی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا قرآن اور سُنّت سے اس طریقے کی واضح طور پر اجازت ملتی ہے یا اس کی حیثیّت محض ایک قانونی افسانہ کی ہے۔ وہ آیت جس سے تعدّدِ ازدواج کی اجازت ملتی ہے، اُس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ بیویوں کے رکھنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ ایک ہی پہ اکتفا کرے۔ وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ[۱]

فقہاء نے مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ کی تاویل یہ کی ہے کہ کنیزوں سے بھی مباشرت کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کی زیادہ اچھی تاویل یہ کی جا سکتی ہے کہ کنیزوں کو بھی بیویوں کا درجہ دیا جا سکتا ہے اگر کوئی آزاد عورت میسّر نہ ہو لیکن مقامِ افسوس ہے کہ اس آخری تاویل کو اختیار نہ کیا گیا۔ یہ مسئلہ اُس وقت اور بھی اُلجھ جاتا ہے جب تاریخ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ خود پیغمبر اسلامؐ کے حینِ حیات جنگ میں قید ہونے والی عورتوں کو کنیزوں کی حیثیت سے تقسیم کیا گیا۔ البتہ تاریخ سے اس بات کی پختہ شہادت نہیں ملتی کہ وہ عورتیں جو پیغمبر

---

[۱] قرآن ۴:۲۵

اور بنی قریظہ کے یہودیوں سے جنگ کے بعد قید ہوئی تھیں، اُن کو بھی کنیز بنا یا گیا تھا۔ حضرت صفیہ اور حضرت صفیہ دونوں ان لڑائیوں کے بعد پیغمبر اسلامؐ کے حصّے میں آئیں۔ آپؐ نے ان دونوں سے نکاح کر لیا۔ اور اُنہیں پُورا قانونی درجہ بخشا۔ حضورؐ نے اپنے گھر میں کبھی کوئی کنیز نہ رکھی۔ اس بات کی بھی بہت کم شہادت دستیاب ہوتی ہے کہ خلفائے اربعہ نے کبھی کوئی کنیز رکھی ہو۔ اگر خلافت راشدہ کے زمانے میں کنیزوں کا عام رواج ہوا تو وہ جاہلی روایات کی بنا پر تھا۔ نہ کہ کسی اسلامی حکم کی وجہ سے۔ اس قسم کی بہت سی جاہلی روایات برقرار رکھی گئی تھیں۔ جاہلیّت سے اسلام کی طرف جو تبدیلی ہوئی وہ اتنی تیز تھی کہ انقلاب کی گرماگرمی میں چھوٹے چھوٹے مسائل پر پوری توجّہ نہ دی جا سکی۔ خلفائے راشدینؓ کو اتنا وقت نہ ملا کہ وہ ان مسائل کو حل کر سکتے جو ان جاہلی روایات کی پیداوار تھے۔ خلافتِ راشدہ کا جلد ہی خاتمہ ہو گیا اور یہ مسائل بڑھتے گئے۔ کنیزوں کا رواج بھی ان میں سے ایک تھا۔ اموی دَور میں اس طرف سنجیدگی سے توجّہ نہ دی گئی۔ عباسی خلافت کے آغاز کے وقت اس عمرانی عادت کی بُرائیاں اتنی جڑ پکڑ چکی تھیں کہ انہوں نے اسلامی معاشرے کے قلب میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ کنیزیں کھُلے بندوں بیچی اور خریدی جاتی تھیں اور اُنہیں خلفاء و اُمراء کے لیے رشوت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اگر قرونِ اولیٰ کے مسلمان اس مسئلے کی طرف توجّہ کرتے، اور کنیزوں کے لیے قانونی جواز حاصل کرنے سے احتراز کرتے تو اس بُرائی کی نشو و نما کو روکا جا سکتا تھا اور اس بُرائی سے پیدا ہونے والے نتائج کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کنیزوں کا مسئلہ اسلام کے نام پر ایسا دھبّہ بن گیا جس کی ذمّہ داری اسلام پر عائد نہیں ہوتی۔

اہلِ کتاب سے ازدواجی تعلّقات

اسلام نے مسلمان مردوں کو یہودی اور عیسائی عورتوں سے شادی کی اجازت دے رکھی ہے۔ یہ رعائت یکطرفہ ہے۔ مسلمان عورتوں کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اہلِ کتاب مردوں سے شادی کر سکیں۔ ایک یہودی عورت کے مسلمان خاندان میں داخلہ کی پہلی مثال حضرت ریحانہ ہیں جو بنو قریظہ کی شکست کے بعد قید ہوئیں اور پیغمبر اسلامؐ کے حصّے میں آئیں۔ ان کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔ یہ بات واضح نہیں کہ آنحضرتؐ نے ان سے نکاح کیا یا نہیں۔ بہرصورت وہ ان کے زیر سایہ آزاد شدہ عورت کی حیثیت سے زندگی بسر کرتی رہیں، مگر ان کے علاوہ باقی تمام یہودی عورتیں کم و بیش مسلمان گھرانوں میں رہنے لگی تھیں۔ یہودی عربوں کے مقابلے میں زیادہ مہذّب تھے اور ان کی عورتیں بھی زیادہ شائستہ، زیادہ خوبصورت اور زیادہ وضعدار تھیں۔ اسی بنا پر مسلمان انہیں زیادہ پسند کرتے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے عیسائی عورتوں سے شادیاں نہیں کی تھیں ان میں صرف ماریہ قبطیہ مستثنیٰ

ہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عراق، ایران، شام، فلسطین، اور مصر کی فتوحات نے مسلمانوں کو بڑے بڑے عیسائی اور یہودی فرقوں سے بالکل قریب کر دیا۔ چونکہ اسلام اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کی اجازت دیتا ہے اس لیے مسلمان اپنے گھروں کو ان عورتوں سے بھرنے میں ذرا بھی نہ ہچکچائے۔ عراق کے ایک عرب قبیلہ کے عیسائی سردار عبدالمسیح کی لڑکی کا قصہ اس رجحان کی توضیح کرتا ہے۔ اس زمانے میں یہ عام تصوّر تھا کہ عیسائی اور ایرانی عورتیں، عرب کی اکھڑ، ناشائستہ، غیر مہذب اور مغرور عورتوں کے مقابلے میں زیادہ اچھی رفیقۂ حیات ثابت ہوتی ہیں اور ان سے شادی کر کے انسان زیادہ لطف اُٹھاتا ہے۔ یہ میلان اس قدر بڑھ گیا کہ حضرت عمرؓ نے اس رعایت کو ختم کر دیا۔ حضرت عمرؓ کا یہ فعل اس بات کی علامت ہے کہ یہ خرابی بہت دُور تک جا پہنچی تھی اور عیسائی اور یہودی عورتوں کے ذریعے غیر مسلم عناصر نے، مسلمان گھرانوں کے ماحول اور ان کی معیشت کو بہت زیادہ خراب کر دیا تھا۔ اس کے باوصف ان عورتوں کی کچھ خوبیوں کو بھی عربوں میں رواج پانے کا موقع مل گیا۔ ان کی اعلیٰ تعلیم و تربیّت اور ثقافتی روایات نے مسلمان آبادی پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ انھوں نے صحرانشینوں کے اکھڑپن اور بربریّت کو بڑی حد تک دُور کیا۔ ان عورتوں کا اثر خاص عرب کے علاقے کے مقابلے میں، بیرونی صوبوں میں اور بالخصوص سلطنتِ روما کے مفتوحہ علاقوں میں زیادہ تھا۔

مختصر یہ کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مسلمان گھرانوں میں بہت بڑا تغیّر رونما ہوا۔ اصلی عرب تعداد میں بہت کم تھے۔ جنگی تقاضوں اور انتظامی معاملات کے لیے عملے کی ضروریات کے پیش نظر وہ مجبور تھے کہ وہ اپنے خاندانوں کے حلقے زیادہ سے زیادہ وسیع کریں اور جلد از جلد اپنی آبادی میں اضافہ کریں[1]۔

مثال کے طور پر مُہلّبؔ بن ابی صفرہ کے تین سو بچّے تھے۔ عبدالرحمٰن بن الحکم الدّموی نے دوسو اولادیں چھوڑیں۔ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ تعداد بڑھائی جائے۔ باقی تمام مسائل جو ایسے بڑے بڑے خاندانوں کی پرورش سے پیدا ہوئے، اُن کی طرف نہ تو توجّہ کی گئی اور نہ اُنہیں وقتی طور پر اتنا زیادہ اہم گردانا گیا۔ اُس ثقافتی تصادم کے سلسلے میں زیادہ مبالغے سے کام نہیں لیا جا سکتا جو عرب بیویوں، کنیزوں اور اہلِ کتاب کی عورتوں کے ایک ہی گھر میں جمع ہو جانے سے رونما ہو رہا تھا۔ اسی طرح روز روز کے جھگڑے اور وہ تمام جرائم جو اس قسم کے خاندان کی پیداوار تھے؛ بڑے خوفناک تھے۔ ان تمام چیزوں کے باوصف اسلام کی موجودہ قوّتیں ان تمام مسائل کو اپنے دھارے میں بہا کر لے گئیں۔ اور ان کو اجازت نہ دی

---

[1] ابن خلکان جلد دوم، ص ۱۴۷، جرجی زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی۔ جلد چہارم، ص ۴۲۔

کہ وُہ مختلف اطراف میں اور مختلف شعبوں میں اسلام کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتے۔ لیکن ان مسائل نے کچھ وقت گذرنے پر زیادہ کڑی شکل اختیار کر لی اور عرب معاشرے کو کُمیتاً منتشر کر دیا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مسلمانوں کی اقتصادی خوش حالی ہماری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے۔ اور ہماری تنقیدی صلاحیتیں ماؤف ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس زمانے میں ہر شے نفیس اور عجیب و غریب تھی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وُہ معاشرہ اپنے اندر بڑے دل گُردے والے آدمیوں کو رکھتا تھا اور اُس کے سامنے بڑے بلند و اعلیٰ نصب العین تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت کو آسانی رد نہیں کیا جا سکتا کہ اسی معاشرے نے اپنی حدود کے اندر ایسے اداروں کو پروان چڑھایا جن میں سے بعض ادارے خود اس کی آئندہ ترقی میں آڑے آئے۔ اور اسلام کی صحیح تفہیم کے راستہ میں اُن کی بنا پر رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ صرف یہی نہیں کہ بہت سے ادارے جو وقتی ضروریات کے تحت پیدا ہوئے تھے، آگے چل کر اسلام کے مُستقل عمرانی اصول بن گئے۔ بلکہ انہوں نے اسلامی معاشرے کی صحت مندانہ نشوونما کو بھی نقصان پہنچایا۔ اور مزید آزاد تجربہ کاری کو روک دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نے معاشرے میں عورت کے درجے کو بالکل بدل دیا تھا۔ لیکن اس بات کو صرف نظریاتی طور پر قبول کیا گیا۔ آزاد عورتوں اور کنیزوں میں جو فرق تھا۔ اُس نے نہ صرف ایک خاندان کی ہم آہنگی اور خوشیوں کو نقصان پہنچایا بلکہ خود عورت کے درجے کو بھی کافی حد تک متاثر کر دیا۔ کنیزوں کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ تھی[1] اور ان کی حالت غیر معمولی طور پر قابلِ رحم تھی۔ اور یہ بات اس زمانے کے معاشرے کی بڑی خراب تصویر پیش کرتی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی ہم عورتوں کو ایک طبقے کی حیثیت سے کوئی اہم کام کرتے ہوئے نہیں پاتے۔ اور وہ عمرانی ترقی یا اس زمانے کی اقتصادی اور سیاسی زندگی میں کسی قسم کا اہم حصّہ لیتے ہوئے نظر نہیں آتیں۔

یہ سب باتیں عرب اور مسلمان گھرانوں کے متعلق کہی گئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں غیر مسلموں کی تعداد بہت زیادہ تھی یہ بات تاریخ کی ایک مسلّمہ شے ہے کہ فاتح قوم کی دولت و ثروت، جاہ و حشم، اور ترقی و نشوونما ہمیشہ مفتوحین کے دم قدم سے قائم ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے مؤرخین نے ہمیں ایسا مواد بہت کم دیا ہے جس سے ہم ان محکوم قوموں کی کوئی واضح تصویر کھینچ سکیں۔ ہمیں صرف یہی بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام کی آمد کا استقبال کیا۔ اور وہ اسلامی حکومت کے ماتحت بہت خوش تھے۔ یہ بات یقیناً درست ہو گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا اس نئے مذہب کے ماننے والے بھی اتنے اچھے تھے جتنا اچھا یہ مذہب تھا۔ عمر فاروق اعظمؓ کے دورِ حکومت میں غیر مسلم یقینی طور پر ہر اُس شے سے لطف اندوز ہوتے تھے جو اُن کا حق تھا لیکن خلافتِ راشدہ کے آخری دور میں حالات بڑی حد تک بدل چکے تھے۔ اور یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ پہلی خانہ جنگی کے دوران میں محکوم قوموں سے وُہی سلوک ہوتا رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔

(باقی)

---

[1] المسعودی۔ مروج الذہب۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۴۳۔ جرجی زیدان (حوالہ مذکور) جلد اول صفحہ ۶۹

موالی اور ان کا معاشری مرتبہ[1]

اس کا آغاز غلامی کے رواج سے پیدا ہوا۔ قبل اسلام بھی یہ ادارہ موجود تھا۔ جسے بعد میں اصلاح دے کر وسعت دی گئی۔ اور آخر کار اسلام کے ماتحت یہ ایک عملی اور مذہبی ادارے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مولیٰ کے لفظی معنی آقا، غلام، ہمسائے، ابن العم، حلیف، بیٹے، چچا، مہمان، مُحِبّ، مُقلّد، داماد، اور خدا کے ہیں۔ ان میں سے بہت سے معنی مجازی ہیں۔ تاریخ اور قانون کی اصطلاح میں اس لفظ کے تین مطلب لیے جاتے ہیں۔

ا۔ آزاد شدہ غلام۔

ب۔ معاہدے کے ذریعے مولیٰ بننے والا آدمی،

ج۔ اور خون کے ذریعے سے مولیٰ کہلانے والا شخص۔

ا۔ آزاد شدہ غلام: یہ بات پہلے بیان میں آچکی ہے کہ اسلامی مملکت میں جنگی قیدیوں کو مجاہدین میں غلاموں کی حیثیت سے تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے سے کوئی غلام اسلامی معاشرے میں داخل ہوتا ہے۔ لیکن زمانۂ قریب اور قرون وسطیٰ میں یہ رواج بھی تھا کہ مالِ تجارت کی طرح غلام اور کنیزیں بیرونی ممالک سے درآمد کی جاتی تھیں۔ اگرچہ اسلام نے نہ تو اس رواج کو جائز قرار دیا تھا۔ اور نہ اس کی اجازت دی تھی۔ یہ بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام غلامی کو قابلِ قبول نہیں گردانتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بہت سے ایسے طریقے تجویز کیے ہیں۔ جن کے ذریعے وہ غلام جو مسلمان معاشرے میں داخل ہو جائیں، آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور انہیں شہری حقوق مل جاتے ہیں۔ یہ طریقے صرف جنگی قیدیوں پہ عائد ہوتے ہیں۔ مگر عملی طور پہ ہر صورت میں ان کا استعمال ہوتا تھا۔ اور تمام قسم کے غلاموں پہ ان کا اطلاق کیا جاتا تھا۔

ان میں سے زیادہ معروف طریقہ تو یہ تھا کہ صلۂ رحم کے طور پہ غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ مسلمانوں کو یہ ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ ہر خوشی کے موقعے پہ، کفارۂ گناہ کے طور پر اور اسی طرح دوسری صورتوں میں غلاموں کو آزاد کریں۔ اکثر اوقات یہ ہوتا تھا کہ کسی معمولی سی خدمت کے عوض میں اظہارِ تشکر کے طور پہ غلام کو آزاد کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً جب پیغمبرِ اسلامؐ نے فتح مکہ کے بعد طائف پر چڑھائی کی تو آپؐ نے یہ عام اعلان کیا کہ وہ تمام غلام جو اسلامی لشکر میں شریک ہوں گے، آزاد ہو جائیں گے اور انہیں مولائے خدا اور مولائے رسولؐ کہا جائے گا۔ غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد واقعی بھاگ کر مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو گئی۔

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں قابلِ ملاحظہ ہیں،
جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی جلد چہارم ص۲۰-۱۵ ، احمد امین - ضحی الاسلام جلد اوّل۔

رواج یہ تھا کہ جب کوئی غلام آزاد کیا جاتا تو اس کی پیشانی کے بال تراش لیے جاتے اور اُسے اجازت دی جاتی کہ وُہ اپنی راہ اختیار کرے۔ اور اس کے بعد اسے اُس شخص کا مولیٰ کہا جاتا جس کے پاس اس کے بال تھے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ حقوقِ مولائیت کسی دوسرے شخص کے پاس بیچ دیئے جاتے۔ اور وُہ بال خریدنے والے کی تحویل میں چلے جاتے۔ بعض اوقات یہ ہوتا کہ آقا غلام سے خوش ہوا اور اُس نے کہا کہ میری موت پر تم آزاد ہو جاؤ گے۔ اس قسم کا غلام وقتی طور پر نصف آزادی کا حامل ہوتا اور اُسے "مدبّر" کہا جاتا۔ اکثر اوقات تقریبات پر بھی، مثلاً شادی یا کسی بچّے کی پیدائش کے موقعے پر غلاموں کو آزاد کیا جاتا۔

باقاعدہ معاہدے کے ذریعے بھی آزادی عمل میں آتی۔ غلام یہ وعدہ کرتا کہ وہ آقا کو اپنی آزادی کے صلہ میں ایک مخصوص رقم قسطوں میں ادا کرے گا۔ اس طریقے کا نام "المکاتبہ" تھا۔ سعید المقرّی نے اپنی آزادی اسی طرح حاصل کی اور اُس نے اپنے مالک کو چالیس ہزار درہم اور ہر عید الضحیٰ کے موقعہ پر ایک بکرا دینے کا وعدہ کیا۔

جب کوئی کنیز مالک کے ساتھ خلوتِ صحیحہ حاصل کر لیتی اور اُس کے ہاں بچہ پیدا ہو جاتا تو اُس کے آقا پر یہ پابندی عائد ہو جاتی کہ وُہ اس کا احترام کرے۔ اب وُہ اسے کنیز کے طور پر بیچ نہیں سکتا تھا۔ اور وُہ اس کی موت پر خود بخود آزاد ہو جاتی تھی۔

ان کے علاوہ کچھ اور قوانین بھی تھے جو اس طرح کے آزاد غلاموں پر عائد ہوتے۔ عام قانون یہ تھا کہ یہ شخص اپنے مالک کا مولیٰ کہلاتا اور مالک کو صاحبِ ولی کہا جاتا۔

بعض اوقات یہ بات بھی طے ہوتی کہ ولی کا حقدار وہ شخص ہوگا جو آزاد کرانے کے لیے رقم ادا کرے۔ عام اصول کے مطابق جب کوئی مولیٰ مر جاتا تو اُس کا مالک اُس کا وارث ہو جاتا۔ لیکن بعض اوقات مکمّل آزادی بھی بخش دی جاتی۔ اس صورت میں آقا اپنے غلام سے کہتا کہ "تم مطلقاً آزاد ہو"۔ سلیم مولائے ابی حذیفہ کا معاملہ ایسا ہی تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے یہ قرار دیا تھا کہ ولی کا حق دار آزاد کرانے والا ہوگا۔ اور اسی بُنیاد پر اس رواج کی عمارت تعمیر ہوئی۔ نبی اکرمؐ سے یہ روایت کی جاتی ہے کہ انہوں نے فرمایا "بیشک مولیٰ کا والی وہی ہے جس نے اسے آزاد کروایا ہو"۔ یہ حدیث غالباً صحیح ہے اور بخاری میں موجود ہے۔ لیکن اس سے یہ پابندی عائد نہیں ہوتی کہ آزاد شدہ غلام اپنے آپ کو اپنے پرانے آقا سے ضرور متمسک رکھے۔

بعض اوقات ایک شخص یا ایک پورا قبیلہ کسی طاقتور فرد یا قبیلے سے اتحاد کر لیتا ہے، یہ ایک رسمی معاہدہ کی شکل ہے جس کے ذریعہ ایک کمزور فرد یا قبیلہ اپنے سے زیادہ طاقتور فرد یا قبیلے کی حمایت حاصل کر لیتا ہے، اور ان کی حفاظت میں آجاتا ہے۔ یثرب کے یہودی اس کی مثالیں ہیں۔ جو بنی

اوس اور بنی خذرج کے موالی تھے۔ قبل اسلام کے بیشتر موالی اسی قسم کے تھے۔ عرب فاتحین تھے اور اسی لیے مفتوحہ اقوام میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی عرب قبیلے سے منسلک کر لیا تھا۔ اس کا مقصد بعض اوقات خدمت گزاری تھا، بعض اوقات باہمی مفاد اور کبھی محض تعلقات استوار کرنا ہی تھا۔ تمام کے تمام اہل خراسان بنی عباس کے موالی تھے۔ اسی طرح ہسپانیہ میں بنی امیہ کے موالی کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ ہر عرب قبیلہ اور ہر ذی اثر عرب کے ساتھ موالی کی بہت بڑی تعداد منسلک تھی، البتہ اسلام نے یہاں یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ صرف غیر عرب مسلمان ہی موالی ہو سکتے ہیں، کیونکہ غیر مسلموں کو ذمی کہا جاتا تھا اور اس اصول کا استنباط قرآن مجید کی اس آیت سے کیا جاتا تھا۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ۔

بعض اوقات ایک مولی کسی دوسرے قبیلہ کے موالی میں شادی کر لیتا اور اس طرح سے ایک نیا رشتۂ ولا قائم کرتا۔ شاعر اسی قسم کا مولی تھا جو پہلے بنی خزاع کا مولا تھا لیکن جب اس نے موالی بنی ابولہب کی ایک عورت سے شادی کر لی تو اس نے اپنے آپ کو بنی ہاشم سے متعلق کر لیا۔ یہ رواج بہت عام تھا کیونکہ موالی کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ آزاد افراد یعنی عربوں سے شادی کر سکیں۔ مثال کے طور جب حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی کی شادی سلمان فارسیؓ سے کرنا چاہی تو ان کے صاحبزادے عبداللہؓ نے سخت اعتراض کیا۔ اور یہ شادی نہ ہو سکی[1]۔

ان موالی کے لیے کچھ خاص اصول بھی تھے، اور بعض عام قوانین بھی۔

عمومی قوانین

مولا کا درجہ آزاد فرد سے کم تھا لیکن وہ غلام سے عالی رتبہ ہوتا۔ مثال کے طور پر اسے غلاموں کی طرح بیچا نہیں جا سکتا تھا۔ مگر شادی اور وراثت کے سلسلہ میں اسے وہ حقوق حاصل نہیں تھے جو آزاد افراد کو نصیب تھے۔ مولی کسی آزاد عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دیت بھی نصف ادا کرنا پڑتی تھی اور اسی طرح کسی جرم کے لیے اس کی سزا بھی نصف ہوتی۔

خصوصی قوانین

ان قوانین کا انحصار ولا کی قسم پر ہوتا۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم یہ تھا کہ آزاد کردہ غلام کا ورثہ تو طبعاً لیکن

---

[1] جرجی زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی۔ جلد۔ ۴۔

خود اسے وراثت نہ ملتی، لیکن وہ مولی جو اتحاد کے طریقہ سے بنتا اُسے نہ وراثت دی جاتی نہ اس کا ورثہ حاصل کیا جاتا۔ اور شادی کے ذریعہ مولی بننے والے شخص کو ورثہ بھی پہنچتا اور اس کا ورثہ تقسیم بھی ہوتا۔

یہ قوانین زیادہ تر دَورِ جاہلیت میں رائج تھے اور اسلام کی آمد کے بعد بھی برقرار رہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی نصِ قرآنی پر مبنی نہ تھا۔ کیونکہ قرآن نسلی امتیاز کی اجازت نہیں دیتا۔ اور جو احادیث ان کی حمایت میں پیش کی جاتی ہیں وہ ایک طرف تو قرآن مجید کے احکام کی تردید کرتی ہیں اور دوسری طرف رُوحِ سنّتِ نبویؐ کے منافی ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جو مشہور و معروف خطبہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا اس میں انہوں نے ایک بڑی اہم بات کہی کہ عربوں کو غیر عرب پر اور سفید فام کو سیاہ فام پر کوئی تفوّق حاصل نہیں۔ اسلام کے نزدیک شخصی عظمت کا انحصار محض تقویٰ اور خداوندِ عالم کی اطاعت پر ہے۔ اس واضح بیان کے پیشِ نظر ادارۂ ولا کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

اس زمانے کے موالی کی حالتِ زار کی جو تصویر ملتی ہے وہ بڑی بھیانک ہے اور ان کے بارے میں کتاب الاغانی اور قصّوں کی دوسری کتابوں میں، بڑی ناقابلِ یقین کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں عرب فاتح قوم تھے اور انہیں اسلام کا علمبردار گردانا جاتا تھا۔ چنانچہ لازمی طور پر، انتظامِ مملکت میں، وہ ایک درجہ خاص پر فائز تھے۔ لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ ان کے اکثر باعزت اور قابل جانشین موالی ہی تھے یہی وہ لوگ تھے کہ جو تعلیماتِ اسلام اور سنّتِ نبویؐ کے محافظ بنے۔ وہ مذہبی درس گاہوں میں درس دیتے تھے۔ علم و فضل کی ترقی اور نشو و نما کام انہیں کے سپرد تھا۔ یہی دفاتر میں کام کرتے تھے اور دربارِ شاہی میں علمی اور ادبی مشورہ میں یہی شریک ہوتے۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی دفاتر کا کام زیادہ تر موالی ہی کے سپرد تھا۔ مختصر یہ کہ عسکری امور کے ماسوا تمام امورِ سلطنت ان ہی کے حوالے تھے۔

اس لحاظ سے ان کہانیوں کو جو ان کی کمتری کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں ذرا دیکھ بھال کے پڑھنا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ صرف وہی موالی کم مرتبہ ہوتے جو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے آتے تھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ شاذ و نادر ہی ان سے ایسا سلوک ہوتا جس سے ان کے رتبے کی پستی کا پتہ چلتا۔ اس کی واضح ترین مثال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مولی کو مسندِ خلافت کے لیے اپنے جانشین کی حیثیت سے نامزد کرنا چاہا۔ حضرت علیؓ کے بہت سے موالی ان کی فوج میں اعلیٰ رتبوں پر فائز تھے۔

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ موالی کے متعلق یہ قوانین ان پر عائد نہیں ہوتے تھے۔ جو بذریعۂ اتحاد رشتۂ ولی میں منسلک ہوتے۔ اور ان کی حیثیت مملکت میں تاباں تھی۔ شادی اور وراثت کے متعلق جتنے بھی قوانین تھے وہ کافی دیر کے بعد یعنی چوتھی صدی ہجری میں مدوّن ہوئے۔ اور صحیح معنوں میں ان کے ذریعہ اس زمانے

کے عام رواج کو قانونی شکل دی گئی تھی۔ ان سے نہ تو کسی اصول کا سراغ ملتا ہے، اور نہ انہیں ابتدائی دور کا نمونہ گردانا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی مملکت کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ان موالی پر ہی مشتمل تھا۔ اور عملی طور پر نہ صرف یہ کہ وہ عربوں کے برابر رتبے پر فائز تھے بلکہ در اصل ان سے کہیں بہتر تھے۔ اس دعویٰ کی بہترین دلیل یہ ہے کہ ابتدائی زمانے کی اکثر و بیشتر فتوحات خواہ وہ عسکری ہوں یا شہری، زیادہ تر ان ہی موالی کے ذہنِ رسا کا نتیجہ تھیں۔ صرف قیادت عربوں کی ہوتی تھی۔

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق

مصنفہ بشیر احمد ڈار

عہدِ قدیم میں چین، ایران، مصر اور یونان کی تہذیبوں نے حیرت انگیز ترقی کر لی تھی۔ اور اس دَور کے مفکروں نے جو افکار و نظریات پیش کئے انہی کی بنیاد پر آنے والے زمانوں میں انسانی افکار کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوتی رہی۔ اس کتاب میں اسلام سے قبل کے چند بلند پایہ حکماء و مصلحین کے اخلاقی نظریات کا تقابلی مطالعہ کر کے ان کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اور کون فیوشس، گوتم بدھ، زرتشت، مانی، سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم مفکروں اور مصر قدیم کے فلسفیوں کے نظریات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تلاشِ حق انسانی فطرت کا ایک لازمی تقاضا ہے اور عصری تقاضوں کی روشنی میں حقائق تک پہنچنے کے لیے حکمائے قدیم کے افکار کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اور یہ کتاب اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔

قیمت چھ روپے

(ملنے کا پتہ)

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور (پاکستان)